معاصر تاریخ نویسی میں ’ذکرِ میر‘ سے اغماض کا سبب

حفصہ ثانیہ[1]م ڈاکٹر روبینہ رفیق**

Abstract:

"In this joint research article a senior professor of Urdu [I.U.BWP] and a younger researcher of Multan [GCWU] has tried to trace the reasons of neglect of Zikr e Meer by contemporary historian, as Meer Taqi Meer has not followed the popular theme about Ahmad Shah Abdali and Nadir Shah Afghan. They have high lighted the tilt of this great Urdu poet towards indigenous Indian forces resisting invaders from North of India. In this article some delicate related points about Urdu literary tradition have been raised for other researchers too."

اردو کلاسیکی غزل گویوں میں میر ؔ تنہا شاعر ہیں،جن کے کلام سے انسان متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا،کیونکہ میر کے ہاں کیفیت کے ساتھ ا ثر آفرینی کا عمل جا بجا نظر آ تا ہے۔وہ شعر جو کیفیت یا واردات کے سے انداز میں لکھا جائے دل پہ اثر انداز ہوتا ہے۔اس لیے جوشعراثر آفرینی اور معنی خیزی سے خالی ہو اپنے نا مکمل ہونے کا احساس رکھتا ہے۔اس سلسلے میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

> ’’میر کے یہاں زبان و بیان اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی ہے،اسی قدر بلاغت میں فقدان پایا جاتا ہے،(پھر بھی) میر کی غزل فن غزل کی اصولی حیثیت میں سودا سے بہتر ٹھہرتی ہے۔‘‘(۱)

وہ شاعر جس نے بجا طور پر دعویٰ کیا تھا:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

یہ اس اردوشاعر کا دعوی ہے، جسے ہم خدائے سخن کہتے ہیں، مگر افسوس کہ میرتقی میر(پ اکبر آباد ۱۷۲۳ و لکھنؤ ۲۰ستمبر ۱۸۱۰) کے معروف ۷۲ نشتروں سے بھی وقت کے ساتھ ساتھ ادب کے طالب علموں کی شناسائی کم سے کم تر ہوتی گئی(۲)،حالانکہ ان کے بعد آنے والے ہر بڑے شاعر نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا،حتیٰ کہ غالب [پ۱۷۹۷ـو۱۸۶۹]جیسے خود پسند نے بھی کہا:

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میرؔ نے محرومی،تکلیف،تنگ دستی اور نازک مزاجی کے باوجود ایک طویل عمر پائی،نہ صرف ان کا کلیات چھ دیوان پر مشتمل ہے،غزلیات کے علاوہ مثنویات کا ایک ذخیرہ ان کی جودت طبع کا مظہر ہے،فارسی میں بھی انہوں نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ ’نکات الشعرا‘ لکھا،جو قائم کے مخزن نکات سے زمانی تقدیم نہیں رکھتا تو بھی اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کے اولیں تذکروں میں سے ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے گھریلو حالات،اپنے والِد گرامی کے جلالِ درویشانہ،میر امان اللہ سے ان کے لگاؤ اور میر کی تربیت میں ان کے کردار پر روشنی ڈالنے کے ساتھ بہت اہم بیانات پر مشتمل فارسی میں ’ذکرِ میر‘ لکھی۔’ذکر میر‘ میں جو تاریخ میرؔ کے ذریعے بیان ہوئی ہے، وہ عام طور پر ان کے معاصر کسی بھی مورخ کے ہاں نہیں ملتی۔میر ہمیں مصلحت سوزی کے ساتھ اپنے عہد کی ایسی حقیقی تاریخ سے متعارف کرواتا ہے کہ انہیں محض دردو غم کا شاعر کہنے والے بھی حیران رہ جاتے ہیں کہ یہاں آپ بیتی کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سچی ترجمانی بھی ہوتی ہے،ایسی سچی ترجمانی جس کا جھکاؤ شمال سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کے مقابلہندوستان کی مقامی قوتوں کی طرف ہے،اس لئے اس

---

[1]پی ایچ ڈی سکالر، گورنمنٹ ویمن یونیورسٹی ملتان
** چیئرپرسن شعبہ اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

تصنیف کو ہم تاریخ کا ماخذ ہی نہیں ایک ہندی مسلمان کی ایسی تاریخ نویسی کہہ سکتے ہیں،جو اس سرزمین کے عوام کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہے،غارت گر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے بارے میں بھی،کاش میر نے اپنی اس تاریخ نما سوانح کے لئے بھی کہا ہوتا:

’لفظ‘میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

معاصر تاریخ نویسی میں ’ذکرِ میر‘ سے اغماض کے اسباب تلاش کرنے سے پہلے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر جس کی قبر لکھنؤ کی ریل کی پٹڑی نگل گئی،اردو دنیا کی تحقیق و تنقید کا موضوع بننے کے باوجود اغلاط سے پاک اور الحاقات سے آزاد ایک معتبر کلیات کا حق دار ہے،ان کے ایک ناقد اور محقق کا شکوہ سن لیجئے احمد محفوظ لکھتے ہیں:

’’یہ امر کس قدر عبرت انگیز ہے کہ جس شخص کو ہم اپنی زبان کا سب سے بڑا شاعر جانتے اور مانتے چلے آرہے ہیں،اسے گذرے ہوئے دو سوسال ہونے کو ہیں اور اب تک اس کے مکمل کلام کا ایسا مجموعہ ہم پیش نہیں کر سکے،جو صحت متن کے لحاظ سے پوری طرح نہ سہی لیکن ایسا ضرورہوتا کہ اس پر ممکن حد تک اعتماد کیا جا سکتا۔‘‘(۳)

اسی طرح میر ؔ کی ایک مثنوی جو ’’نسنگ نامہ‘‘ سے جانی جاتی ہے،مگر بعض محقیقین نے اسکا اصل نام ’’تسنگ نامہ‘‘ بتایاہے اسکی ایک اہم شہادت میر کی اسی مثنوی کے ایک شعر میں موجود ہے:

واں سے لاوڑ تسنگ پھر واں سے
جا کے واں تنگ آگے جاں سے

احمد محفوظ بیانِ میر میں لکھتے ہیں:

’’چوہدری محمد نعیم کی انتہائی اہم کتاب مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس منظرِ عام پر آئی، جو’’میر کی خود نوشت‘‘ ،’’ذکر میر‘‘ کا انگریزی ترجمہ ہے۔چوہدری نعیم صاحب کی اس کتاب سے معلوم ہوا کہ جس گاؤں کے سفر کاذکر میر نے اپنی اس مثنوی میں کیا ہے،اسکا نام ’’نسنگ‘‘ (یعنی مع ن) نہیں بلکہ ’’تسنگ‘‘ (یعنی مع ت)tisang ہے۔چوہدری نعیم صاحب نے لکھا ہے کہ سرکاری کاغذات کی جانچ سے اس نام یعنی ’’تسنگ‘‘ کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں ’’تسنگ‘‘ کو صحیح مانے بغیر چارہ نہ تھا... مزید تصدیق کے خیال سے میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے اردو خط و کتابت کورس کے شعبے سے وابستہ جناب جمیل احمد سے بھی اس بات کا ذکر کیا۔موصوف کا تعلق ضلع میرٹھ سے ہے،اور اس علاقے کی بہت سی جگہوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے میرٹھ میں ایک قصبہ لاوڑ نام کا ہے اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک بستی ہے، جسے بول چال میں تسن (بکسر اول و فتح دوم، بلا قاف فارسی) کہتے ہیں۔ظاہر ہے یہ وہی ’’تسنگ‘‘ ہے جو کثرتِ استعمال سے زبانوں پر ’’تسن‘‘ کی صوارت میں رائج ہو گیا، اب میر کی مثنوی کا یہ شعر بھی واضح ہو گیا؛

واں سے لارڑ تسنگ پھر،واں سے
جا کے واں تنگ آگے جاں سے‘‘(۳)

اسی طرح نامور محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل نے میر کی نظر انداز ہو جانے والی تصنیف کا ذکر کیا ہے، جس میں میر نے مختلف شعراء کے کلام کو منتخب کر کے لکھا مگر اس میں اُن شعرا کے حالات کے ذکر کرنے کا شائد موقع میرکو نا مل سکا، ممکن ہے کہ یہ نکات الشعرا کا نقشِ اول ہو یا اس کا اردو روپ ہو،بہرطوریہ تصنیف’’مجموعِ نیاز‘‘ کے نام سے موتی محل کتب خانہ میں موجود ہے۔ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

’’مجموعِ نیاز، یا مجموعہ نیاز کا میر کی تالیف ہونا ناممکن بھی نہیں، راقم کو انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی، کوالالمپور (ملیشیا) کے موقر و معروف تحقیقی ادارے International Institute of Islamic Thought and Civilizationکے کتب خانے میں،ذخیرہ عبدالرحمٰن بار کر میں اس

نوعیت کی میر کی ایک تالیف کا قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے،جس سے میر کے حالات وکلام کے تمام مآخذ خاموش ہیں۔مذکورہ ذخیرہ عبدالرحمٰن بارکر کے فہرست نگار نے اسے''تذکرہ شعرائے فارسی'' قرار دیا ہے۔''(۵)

دنیا ئے علم مولوی عبدالحق(۱۸۷۰-۱۹۶۱) کی ممنون ہے کہ انہوں نے اردو کی ابتدائی تاریخ کو اعتبار بخشنے والے دیگر مخطوطوں اور نسخوں کی طرح 'ذکر میر' کے نسخے کو بھی دریافت کیااور اسکا تقابل دیگر نسخوں سے بھی کیا اور انجمن ترقی ترقی اردو ہند اورنگ آباد دکن سے ۱۹۲۸ میں حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ جسے اردو روپ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے دیا(میر کی آپ بیتی،ذکر میر کا اُردو ترجمہ مع فارسی متن،نثار احمد فاروقی،انجمن ترقی ارد و (ہند)نئی دلّی،۱۹۹۶ء) میر نے'ذکر میر' میں جس دور کی ترجمانی کی ہے یہ افراتفری کا دورتھا۔بیرونی حملہ آورں اور تخت و تاج کی ہوس اور اندرونی خانہ جنگی نے مغلیہ حکومت کو زوال کی طرف دھکیلناشروع کر دیا تھاہمارے شہنشاہ شاہ شطرنج کی حیثیت تک محدود ہو گے تھے۔ایک طرف احمدشاہ ابدالی حملہ آور ہوتا تو دوسرے ملک کے اندر افغان،مرہٹے اور جاٹ اودھم مچاتے ہوئے نظر آتے ہوئے ہیں 'ذکرمیر'میں میر نے ان حالات کو ہندوستانی طرزِ احساس اور تناظرسے پیش کیا ہے کہ ہمارے وہ ہیرو یعنی احمد شاہ ابدالی[۱۷۲۲-۱۷۷۳] اور نادر شاہ [۱۶۹۸-۱۷۴۷]جن کو ہم مسلمان فاتحین یا ہیرو کے طور پہ جانتے آئے ہیں اور اپنی عقیدت ان پہ نچھاور کرتے آرہے ہیں، جس کے سبب ان کی طرف سے قتل عام یا لوٹ مار کو نظر انداز کرتے آئے ہیں،یوں 'ذکر میر' ہماری بطل پرستی یا ہیرو ازم کا طلسم توڑ کے حقیقی تاریخ کے جوہر کو پیش کرتی ہے۔ میرؔ نے جو بھی لکھا ہے اس میں قیاس یاتخیل کی بنیاد کو کوئی داخل نہیں ہے۔ان واقعات میں سے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو میر کے سامنے رونما ہوئے اور اکثر معرکوں میں تو میر خود بھی موجود تھے،اور ایسے ایسے واقعات قلم بند کئے جو ہمارے کسی اور معاصر مسلمان مورخ کے قلم سے نظر نہیں آتے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی[۱۹۳۴-۲۰۰۴]کی ترجمہ شدہ ذکرِ میر سے دو اقتباسات دیکھئے؛

''اس انقلاب (حملہ نادری) کے بعد پھر سنگ دل زمانے نے مجھے ستایا۔ان لوگوں نے جو درویش کی زندگی میں میری خاک کفِ پاکو سر مہ بناتے تھے اب مجھے نظروں سے گرادیاناچار دوبارہ دہلی پہنچا اور (سوتیلے)بھائی بڑے کے ماموں،سراج الدین علی خاں کے احسانات کا بھاری بوجھ اُٹھایا .....۔'' [ص.۳۱۱]

دوسری جگہ براہِ راست لکھا گیا،مصلحت سوز اسلوب میں:

'' نادر شاہ درانی ۹۳۷۱ء کو فتح و ظفر مندی کا نقارہ بجاتا ہوا،دہلی میں داخل ہوا،۳۱،۲۱،۱۱ مارچ (۹۳۷۱ء) کو دہلی میں قتل عام کیا۔جس سے میں ہزار سے زائد انسان قتل ہوئے ۵ مئی ۸۵دن قیام کرنے کے بعد اس حالت میں رخصت ہوا کہ آٹھ مغل تاجداروں کے جمع کئے ہوئے خزانے اسکی مٹھی میں تھے۔'' [ص.۲۲۱]

ناقدینِ میر نے میر کے زمانے کے احوال کے عکاس بہت سے اشعار گنوائے ہیں جیسے:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

(غلام قادر روہیلہ کا دہلی پر قبضہ [۱۸جولائی تا ۲ اکتوبر ۱۷۸۸ اور شاہ عالم ثانی[۱۷۲۸-۱۸۰۶]کا نابینا کیا جانا)

سکھ ، مرہٹے ، چور اُچکے سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے ، فقر بھی اک دولت ہے یاں

یہی نہیں میر کی شاعری میں دھواں کھنڈر،خرابہ شکستگی لٹے نگر جیسی تراکیبیں نہیں تمثالیں ملتی ہیں جو اُس عہد کی شکست و ریخت کی حسی تصاویر بناتی ہیں:

دیدنی ہے شکستگی دل کی

کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دل کی خرابی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

روشن ہے اس طرح دل ِویراں میں داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

اب ذکرِ میر سے تفصیلی اقتباسات دیکھئے،جو مقالہ نگاروں کے استدلال اور نقطہ نُظر کو سمجھنے میں مدد گار ہو سکتے ہیں:

(الف)’’اسی اثناء میں شاہ درانی جو سرہند سے شکست کھاکر واپس ہوگیا تھا اور ہندوستان کا خیال برابر اُس کے سر میں سمایا ہوا تھا بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ لاہور آیاوہاں کے وضیع وشریف نے کون سا ستم تھا جو نہ جھیلا، اور کون سی جفا تھی جو نہ سہی۔ کوئی روکنے والا تو تھا نہیں، یعنی معین الملک پہلے ہی مغلوب ہوچکا تھا کچھ دنوں کے بعد گھوڑے سے گر کر مرگیاوہاں سے ابدالی نے شہر (دلّی) کا قصد کیااُس کی آمد آمد سن کر یاروں کے اوسان خطا ہوگئے۔ بادشاہ اور وزیر سے کچھ نہ بن پڑا، آخر اس کی رسمِ پذیرائی کے لئے گئے اور قید ہوگئے۔راجا ناگر مل، سعد الدین خاں،خاں ساماں وغیرہ جیسے بعض رئیسوں کے ساتھ اپنی حفاظت کے لئے سورج مل کے قلعوں میں چلا گیا۔ تقریباً ایک مہینے تک شہر میں رسد کی تنگی رہی۔ پھر شاہ (ابدالی)نے عالمگیر (ثانی) کو سلطنت کے سپرد کرکے وزیر (عماد الملک) کو اپنے ساتھ لیا اور آگرے کا رخ کیا۔ اُس کی فوجوں نے لوٹ مار شروع کردی متھرا میں جو شہر (آگرہ)سے اٹھارہ کوس اِدھر بڑا با رونق اور آباد شہر تھا، قتل ِ عام ہوا۔ جب ہوا متعفن ہوگئی تو شاہ(ابدالی) نے طاعون کے خوف سے سورج مل کے معاملے کو ملتوی کرکے دفعتہً کوچ کردیا اور محمد شاہ کی بیٹی سے اپنا عقد کرکے بالا بالا نکل گیا۔ عمادالملک آگرے کے نواح میں رہ گیا۔نجیب الدولہ جو صفدر جنگ کی لڑائی(کے زمانے)میں وزیر کا ملازم ہوا تھا، نمایاں ترقی کرکے میر بخشی اور مختارِ سلطنت بن گیا‘‘۔(ص:۱۲۸تا۱۳۱)

(ب) ’’جب بادشاہ نے دوآبے میں ڈیرے ڈالے اور نجیب الدولہ (اُن سے آکر) مل گیا تو دکھنیوں نے لشکر اور شہر کی محافظت کے لئے وزیر کو دستوری دیدی اور خود دریا کے کنارے کنارے آئے اور چھ کوس اُدھر خیمے گاڑ دئیے۔ یہاں وزیر نے شہر کو محکم کرکے ملچار باندھ دئیے اور دار اشکوہ کی حویلی جو دریا کے کنارے واقع ہے، راجا کو سونپ کر نئے بادشاہ یعنی شاہ جہاں (ثانی)سے آملا۔چار روز کے بعد شاہ (ابدالی)اور نجیب الدولہ کی فوجیں ایک ساتھ کوچ پر کوچ کرتی ہوئی دریا تک پہنچ گئیں، جیالے سردار اور جنگ جو، جو سوار (مرہٹوں کی)گوش مالی کرنے پر آمادہ ہوئے۔ روہیلوں کے پیادوں نے پیش قدمی کرکے جنگ شروع کردی، نہایت جانفشانی سے کٹ کٹ کر لڑے۔ ادھر سے دتاّ جو دکن کی فوج کا سردار تھا اپنے کار گزاروں کی مدد کو آپہنچا اور بڑی ثابت قدمی سے اس فوجِ سنگین کے مقابلے میں ڈٹ گیا پہلی ہی تفنگ جو ادھرسے سر ہوئی اس کا ایک تیر دِتاّ کے لگا اور پہلو میں ترازو ہوگیا۔ مرہٹوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اُس کے مردے کو اٹھا کر دریا کے کنارے رکھا، تو انہوں نے دریا کے اس طر آکر مار دھاڑ شروع کی یہ (مرہٹے) ہار کر بھاگ گئے۔ وزیر اپنے سرداروں کو ملچاروں پر چھوڑ کر دکن کی فوج سے مل گیا۔ زمانہ غدار نے بڑی تباہی مچائی دُرانیوں نے (مرہٹوں کی)بھگوڑی فوج کا تعاقب کیا اور اُن میں سے اکثر کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا وہاں سے واپس آکر شہرلوٹنے میں لگ گئے۔۔شام کو راجا شہر سے نکلا اور سورج مل کے قلعوں میں جانے کا قصد کیا اور صحیح سلامت پہنچ گیا۔ بندہ (میر) اپنے ناموس (حرم) کی حفاظت کیلئے شہر ہی میں رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ ’’شاہ

(ابدالی)نے امان دے دی ہے رعایا کو چاہیے کہ پریشان دل نہ ہو''۔مگر جب گھڑی بھر رات گزری تو غارت گروں نے مظالم شروع کئے، شہر کو آگ لگا دی، گھروں کو جلا دیا اور (سارا سازوسامان) لے گئے۔ صبح کو جو (گویا)صبح قیامت تھی تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل وغارت میں لگ گئے۔(شہر کے)دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کرلیا بہتوں کو جلا دیا اور سرکاٹ لئے۔ ایک عالم کو خاک وخون میں لٹایا اور تین دن رات تک ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا۔ کھانے اور پنے کی چیزوں می سے کچھ نہ چھوڑا چھتیں توڑ دی، دیواریں ڈھا دیں سینے زخمی اور کلیجے چھلنی کردئیے!وہ بد طینت ہر دروبام پر(چڑھے ہوئے تھے)اور شرفاء کی مٹی پلیدہورہی تھی۔شہر کے عمائد خستہ حال تھے، بڑے بڑے لوگ ایک گھو نٹ پانی کے محتاج تھے،گوشہ نشین بے گھر اور نواب گداگر بن گئے۔ وضیع وشریف ننگے پھرتے تھے، گھر والے نکھرے ہوگئے تھے اکثر بلا میں گرفتار اور رسوائے کوچہ وبازار تھے۔ کتنے ہی مصیبت میں مبتلا تھے اور اُن کے زن وفرزنداسیر۔ شہر پر (غارت گروں کا)ہجوم تھا اور قتل وغارت علی العمو م ہورہی تھی۔ لوگوں کا حال ابتر ہوگیا۔ بہتوں کی جان لبوں تک آگئی (یہ غارت گر)زخم بھی لگاتے اور گالیاں بھی بکتے۔ روپیہ بھی چھین لیتے اور سیدھیا ں بھی سناتے۔ جو سامنے پڑتا اُس کا پاجامہ تک چھین لیتے۔ ایک عالم تکلیفیں جھیل کر مرگیا۔ ایک جہان کی ناموس برباد ہوگئی۔ نیا شہر ڈھے کر خاک سے برابر ہوگیا۔ تیسرے دن نسق مقرر ہو۔ انزلاخاں نامی نسقچی باشی آیا تو لوگو ں کی ٹوپیاں اور نیمہ تن اُس نے اتروا لئے۔ بارے قدغنچیوں نے ان غارت گروں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں۔(اب) وہ بے رحم لوگ پرانے شہر پر ٹوٹ پڑے اور ایک جہاں کو ہلاک کردیا سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ گرم رہا۔ ایک وقت کا کھانا اور پہننے کا سامان بھی کسی کے گھر میں نہ رہا، مردوں کے سرننگے تھے، عورتوں کے پاس اوڑھنی تک نہ تھی،چوں کہ راستے بند تھے بہت سے لوگ زخم کھا کھا کر گزر گئے، کچھ سردی کی شدت سے اینٹھ کر مر گئے۔ (اس فوج نے)بڑی بے حیائی سے حملہ کیا اور (شہریوں کو)بے آبرو کیا، غلہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے، ان غارت زدوں (کی فریاد) کا شور وہنگامہ ساتویں آسماں تک پہنچ رہا تھا، مگر پادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، استغراق کے باعث سنتا نہیں تھا۔ ہزاروں خانہ خراب عین اس بھڑکتی آگ میں دل پر داغ لیے ترکِ وطن کرکے جنگل کی طرف چل دئیے۔ مگر راستے ہی میں چراغِ صبح گاہی کی طرح مرگئے۔ بہت سے مجبوروں کو وہ ظالم اپنے رکاب میں ڈال کے دائرہ لشکر میں قیدیوں کی طرح لے گئے۔ ان جفا کاروں کا دور دورہ تھا، دست درازی کرتے، لوٹتے کھسوٹتے، خوب دولت بٹورتے، عورتوں پر ہاتھ صاف کرتے، اپنی تلواریں لیے مال پر قبضہ کرتے پھرتے۔ شہریوں سے کچھ نہ بن پڑتا تھا کیوں کہ اُن کے جی چھوٹ گئے تھے۔ کوئی مضطرب ہوتا تھا، کوئی حیران تھا، ہر گھر میں ایک بدباطن، ہر کوچے میں قتل گاہ، آزار وگیر ودار عام تھی، ہر طرف خوں ریزی، ہر سمت سزا دہی، چٹکیاں لیتے تھے، طمانچے مارتے تھے۔ غریب لوگ خوف سے سہمے جاتے تھے اور یہ لُٹیرے ملندریاں مارے پھرتے تھے۔ گھر جل گئے، محلے ویران ہوگئے۔سینکڑوں چوب کاری (ایک طرح کی سزا)کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ کسی کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک عالم اُن کے ستم سے ہلاک ہوگیا، مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پرانے شہر کا علاقہ جسے (رونق وشادابی کے باعث)''جہانِ تازہ''کہتے تھے۔ کسی گری ہوئی منقش دیوار کے مانند تھا یعنی جہاں تک نظر جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پانو اور سینے ہی نظر آتے تھے۔ ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہورہی یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی،سیاہی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو مظلوم مر گیا (وہ گویا)آرام پا گیا، (اور)جو اُن کی زد میں آگیا وہ بچ کے نہ جا سکا۔ میں کہ (پہلے ہی)فقیر تھا، اب اور زیادہ مفلس ہوگیا۔ افلاس اور تہی دستی سے میرا حال بہت ابتر ہوگیا۔ سڑک کے کنارے جو میرا تکیہ (مکان)تھا وہ بھی ڈھے کر برابر ہوگیا۔ غرض کہ وہ بے مروت سارے شہر کو لاد کر لے گئے اور شہر کے

لوگ ذلت (ورسوائی)اُٹھا کر جان سے گزر گئے۔(ص:۸۳۱تا۱۴۱)

(ج) ’’بھاؤ بڑا غیور جوان تھا اور دادِ مردانگی دے رہا تھا۔ جب اُس نے اپنی آنکھو ں سے یہ سانحہ دیکھا تو کہنے لگا کہ اب دکھن جانے کا منھ نہیں رہا۔ جان سے ہاتھ دھوکر بڑی دلیری کے ساتھ (ابدالی)فوج کے قلب پر جا پڑا یعنی جان بوجھ کر اپنے تئیں موت کے منھ میں ڈھکیل دیا۔ ملہار جو گُرگِ باران دیدہ، تھا وہا ں سے دو تین ہزارسواروں کو ساتھ لے کر بھاگا باقی تمام لشکر غارت ہوگیا۔ جو سردار زندہ بچے وہ بھکاریو ں کے سے حال میں ننگ دھڑنگ پھر رہے تھے۔ ہزار ہزار بھگوڑے سپاہیوں کے ہتھیار اور گھوڑے اطرافِ شہر (پانی پت)کے دس دس زمینداروں نے مل کر چھین لیے،کیا لکھوں کہ کیسا روزِ بَد اِس قوم کو دیکھنا پڑا۔ ہزاروں ننگے (سپاہی)روتے ہوئے جس راستے سے گزرتے تھے (لوگوں کے لئے)عبرت کا سامان نظر آتے تھے۔ گانو کے لوگ بھنے ہوئے چنے سب کو ایک ایک مٹھی تقسیم کرتے تھے اور اُن کی تباہ حالی کا اپنے حال سے موازنہ کرکے (خدا کا)شکر ادا کرتے تھے۔ ایسی (عبرت انجام)شکست کسی کو کم ہی ہوئی ہوگی۔ بہت سے بھوک سے مرگئے، اور بہتوں نے ٹھنڈی ہوا سے اکڑ کر جان دے دی، جو فوج یہ قلعہ میں چھوڑ آئے تھے شاہی فوج کی لوٹ مار کے خوف سے رات کے وقت بھاگ گئی۔ کروڑوں روپے کا سامان شاہ (ابدالی)کے اور پورب کے سردار کے ہاتھ لگا جسے انہوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ نقد وجنس کے علاوہ توپ خانہ اور دوسرا جنگی سامان، ہاتھی، بیل، گھوڑے اور اُونٹ شجاع الدولہ وغیرہ نے اپنے حصے میں لے لئے۔ دُرانی (سپاہی)جو فقیر محض تھے مالا مال ہوگئے۔ ہر ’دِہ باشی‘کو سو(۰۰۱)اُونٹو ں کا بار ملا اور ہر نفر کو دوخروار۔ بڑی دولت ہاتھ لگ گئی۔ ہر شخص پھولا نہ سماتا تھا۔ شاہ ابدالی اس شاندار فتح کے بعد جو شاہانِ سَلَف میں سے بھی کسی کو میسر نہ آئی ہوگی، بڑے کّروفَرّ کے ساتھ شہر میں داخل ہوا اور اطراف کے سرداروں کے نام فرمان بھیجے کہ آئیں اور نوکری کریں‘‘۔(ص:۱۵۱،۰۵۱)

(د) ’’ (سانحہ)جب یہ طے پایا کہ شاہ ولی خان راجا کے ساتھ جاکر ملک گیری کرے گا تو شاہ ابدالی کی فوج جو مالِ غنیمت سے مالا مال ہوچکی تھی، قلعے کے دروازے پر جمع ہوکر ہنگامہ کرنے لگی اور کہا کہ ہم اپنے گھروں کو جاتے ہیں بادشاہ (ابدالی)یہاں رہنا چاہتا ہے تو رہے۔ ہم تو ایک مدت سے اِسی مہم میں لگے ہوئے ہیں بیوی بچوں کی بھی خیر خبر نہیں۔ شاہ نے سوچا کہ پردیس میں فوج کے بغیر رہنا ممکن نہیں مجبوراً اپنی راجدھانی قندھار کو جانے کا تہیہ کرلیا۔ وزیر نے اپنے خیمے جو وہ آگے بھجوا چکا تھا، واپس منگوا لیے اور یہاں کے سرداروں نے اُسے شرمندہ الگ ہونا پڑا۔(اپنی روانگی)سے دو روز پہلے راجا (ناگرمل)اور شجاع الدولہ کو رخصت کیا۔ شہزادہ جواں بخت کو شاہ عالم کا ولی عہد بنایا اور شہر کا انتظام نجیب الدولہ کے سپرد کرکے دِلّی سے نکلے۔ راستے میں زین خاں نامی افغان کو جو اُنہی کے قوم وقبیلے کا تھا، سرہند کا فوجدار بنایا اور لاہور پہنچ گئے۔ چونکہ اس قوم کا غرور حد سے تجاوز کرچکا تھا، غیرتِ خدا وندی نے اُنہی سکھوں کے ہاتھوں ذلیل کیا جو (پنجاب کے نواح میں) بے اصلوں، جولاہوں، ندافوں، بزازوں، دلالوں، بقالوں، نجاروں، قزاقوں، کسانوں، کم مایہ لوگوں، سفلوں، جنگلیوں، بازاریوں، کمینوں اور تہی دستوں کی ٹولی تھی تقریباً چالیس پچاس ہزار سکھوں نے جمع ہوکر اس لشکرِ جرار کا مقابلہ کیا۔ کبھی تو ایسے مقابل آتے کہ زخم پر زخم کھاتے مگر پیٹھ نہ دکھاتے، اور کبھی اِدھر اُدھر منتشر ہوکر سو(۰۰۱)دو سو (۰۰۲)(ابدالی)سپاہیوں کو گھیر کر لے جاتے اور سب کو تہِ تیغ کردیتے۔ ہر صبح کو فتنہ اٹھاتے ہر شام کو چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے (غرض انہوں نے ابدالی کے)لشکر یوں کو ایسا بوکھلا دیا تھا کہ وہ ہزار جتن سے جان بچا کر بھاگتے تھے، کبھی ظاہر ہوتے اور لشکر پر ٹوٹ پڑتے کبھی سامنے آکر ہلہ بولتے اور جم کر لڑتے، کبھی شہر پر چڑھائی کرتے اور اُس کی ینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ پریشاں بالوں اور بندھے ہوئے جُٹّلوں کے ساتھ فوج میں آتے تھے رات بھر شور وشررہتا اور سارا دن فریاد وفغان (کی ہولناک آوازیں آتیں)۔اُن کے پیادے

سواروں کے تلوار لگاتے اور اُن کے گھوڑوں کی زین کو خون میں لت پت کردیتے۔ اُن کا معمولی سا نوکر (ابدالی کے)تیر اندازوں کو پکڑ کر لے جاتا اور ایذائیں دیتا۔ غرض اِن بے حقیقت کنگالوں نے اُن بے مایہ لوگوں کو ایسا ذلیل ورسوا کیا کہ اطراف کے سرداروں نے یہ ماجرا سنا تو اُنہیں نظروں سے گرا دیا۔ (ابدالی فوج میں)مُقاؤمت کی سکت ہی نہ رہی جان بچا کر نکل بھاگنے کو غنیمت جانا اور اس شہر (سرہند)کی نظامت کا خلعت ایک ہندو کو دے کر اپنا رستہ لیا۔ (سکھوں کی فوج کا)یہ انبوہ اُن کے تعاقب میں لوٹ کھسوٹ کرتا ہوا اور دُون کی لیتا ہوا، دریائے اٹک تک اُن کی گوشمالی کرنے گیا۔ پھر اس صوبے پر قبضہ کرلیا جس کی آمدنی دو کروڑ (سالانہ) تھی۔ کچھ دنوں بعد اس شامت کے مارے ہند کو جو شہر (لاہور (میں مقیم تھا قتل کرکے بالکل مالک ومختار ہوگئے۔ اب چونکہ ملک کا کوئی دعویدار درمیان میں نہ تھا، ان سب عوام کا لا نعام نے ملک کو آپس میں بانٹ لیا اور رعایا پر فیاضیاں شروع کردیں، یعنی حکومت کے طور طریق سے واقف تھے نہیں، کاشتکاروں نے جو کچھ دست برداشتہ دے دیا وہ انہوں نے مفت جان کر قبول کرلیا"۔(ص:۳۵۱تا ٦٥١)

مذکورہ بالا اقتباسات سے مندرجہ ذیل پانچ نکات واضح ہو جاتے ہیں:

١۔ میرتقی میر اپنے زمانے کے آشوب،دلی کے تاجداروں کی نااہلی اور بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار اور سفاکی کے شاکی تھے۔

٢۔ وہ مسلمان اشرافیہ یا پڑھے لکھے خواص کے اس تصور سے مطابقت پیدا نہیں کر سکے تھے کہ بیرونی مسلمان حملہ آور ہندوستان میں اسلام کو تقویت دینے کی غرض سے آئے اور انہوں نے قتلِ عام،لوٹ مار،خزانے کی تلاش میں عورتوں یا بچوں تک پر جو تشدد کیا،اس کا جواز تلاش کیا جائے۔

٣۔ میر تقی میر اس بات پر اپنی خوشی چھپا نہیں سکتے کہ ابدالی کے لشکر کے خلاف مزاحمت میں غیر منظم عوامی قوتوں نے عام ہتھیاروں سے طوفانی یلغار کا اگر رخ نہیں موڑا تو جگہ جگہ اس کی ہیبت کو کم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

٤۔ انہوں نے یہ تفصیل تو بیان نہیں کی کہ خود شاہ عالم ثانی کو دلی کے تخت پر ایک مرہٹہ سردار نے بٹھایا تھا،جس کی وجہ سے پٹھانوں اور روہیلوں کی شاہ عالم ثانی سے کشیدگی بڑھی اور نہ ہی غلام قادر روہیلے اور اس کے خاندان سے روا رکھے جانے والے مغلئی ظلم کی تفصیل بیان کی مگر غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم ثانی کو نابینا کرایا اور دلی پر قبضے کے دوران بادشاہ کی بیگمات اور شہزادیوں سے جو سلوک کیا،اسے بھی روا نہیں جانا۔

٥۔ میر نے ذکر میر میں ان مرہٹوں کو ہیرو کے طور پہ حیرت انگیز طور پہ پیش کیا ہے جنہیں مسلمان اشرافیہ 'کافر،چو اچکے' سمجھتی رہی ہے، میر نے ابدالی کے خلاف مزاحمت میں بہاردی دکھانے والے مرہٹوں کو کھل کے داد دی ہے۔

٦۔ میر پر بھی میرزا جانِ جاناں اور شیخ عبدالعزیز کے ان تصورات کا اثر تھا،جس کے مطابق وید بھی الہامی کتب میں شامل تھے اور خود کرشن بھی اللہ کے برگزیدہ افراد میں شامل تھے۔ 'قادریہ سلسلے کے مشہور بزرگ اور میر کے معاصر مرزا جان جاناں]١٦٩٩-١٧٨٠[ویدوں کو الہامی سمجھتے تھے اور توحید پسند ہندوؤں کو اہل کتاب میں شمار کرتے تھے--شاہ عبدالعزیز جو علمائے حدیث میں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور میر کے معاصر ہیں،کرشن جی کو اولیا اللہ میں شامل کرتے تھے'

٧۔ حالانکہ میرکے اجداد بھی حجاز سے ہندوستان میں آئے تھے مگر ان کے فلسفہ عشق میں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو رچ بس گئی تھی،اسلیے وہ نا تو خود کو بیرونی حملہ آوروں کا سپاس گزار شمار کرتا ہے اور نا ہی طرف دار۔ ہندوستان میں موجود لوگ محتلف مذاہب و عقائد کے پیرو کارتھے اور اپنی اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ محبت و

پیار سے رہنے کی عمومی فضاء قائم تھی،اور مذہبی تہوار بھی مل کر منائے جاتے یا بھگتی اور تصوف کے مشترک اجزا سے پروان چڑھنے والے عوامی کلچر میں سادھو،سنت،فقیر اور درویش یکساں تکریم کے مستوجب تھے اور فقیروں کی درگاہوں اور ان کی کرامات کے لئے عقیدت کے جذبات میں غیر مسلم بھی شریک تھے۔ یہی وہ اسباب ہیں جو یہ سمجھنے میں مددگار ہوتے ہیں کہ کیوں 'ذکرِ میر'کو معاصر تاریخ کی بہت بڑی شہادت کے طور پر نظرانداز کیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسین آزاد:’آب حیات‘،لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی،طبع ششم ۲۰۰۳،ص۱۹۸
۲۔ بحوالہ مسعودالرحمن خان ندوی ’میر کے نشتر‘،الہ آباد: رام نرائن لال پبلشرز ،۱۹۳۰
۳۔ بیان میر،احمد محفوظ،عکس، لاہور ۲۰۱۹ء،ص،۵۳۔۵۴
۴۔ ایضاً : ص، ۵۹۔۶۰
۵۔ ایضاً : ص، ۵۹۔۶۰
۶۔ ’مسلم ہندوستان/ ادب،تاریخ اور تہذیب‘لاہور: سنگ میل ،۲۰۱۵ء ص؛۱۲۵
۷۔ کامل قریشی ڈاکٹر[مرتب] ’اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب‘’میر کے زمانے میں مشترکہ تہذیب کے خط و خال‘از خواجہ احمد فاروقی ۲۰۰۶،اردو اکادمی دہلی ص:۱۰۸۔۱۰۹